جناب مولانا محمد اشرف صاحب ایم۔اے
شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی

سیاست و تعمیرِ ملّت

حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی رح کے افکار کی روشنی میں

عزیز گرامی جناب مولانا سمیع الحق صاحب کے تقاضے پر فقیر کی زیر ترتیب کتاب "سلوکِ سلیمانی" کی ایک فصل ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہے۔ حضرت سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کا سیاسی نظریہ اور تعمیرِ ملّت کے متعلق کچھ افکار پر ان سطور سے غالباً کچھ روشنی پڑ سکے گی۔ قارئین کو اگر کچھ تشنگی نظر آئے تو اسے ہیچمدان کی کم سوادی پر محمول فرمائیں ——— "محمد اشرف"

سیاست ایک دھوپ چھاؤں ہے۔ وہ دم بدم بوقلموں کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ کہ ہر زمانہ کے خیالات یکساں نہیں ہوتے۔ حالات و ظروف بدلتے رہتے ہیں۔ حسن و قبح کے انسانی معیار میں تغیر آتا ہے۔ جو کل حق نظر آرہا تھا۔ وہ آج باطل دکھائی دیتا ہے۔ اور جو آج غلط ہے۔ وہ کل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ انسانی علم کی کوتاہی و نارسائی، مستقبل و مغیبات سے ناآشنائی، حصولِ جاہ و اقتدار اور مال و دولت کی حرص و آز سے مل کر ہر روز نئے نئے سیاسی نظریات کو وجود بخشتی ہے۔ لیل و نہار کی ہر گردش کے ساتھ سیاسی افکار و خیالات، نظریات و طرق میں تغیر و تبدل اور اُتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے۔ اہلِ سیاست اپنے مزعومہ فکری و سیاسی نظاموں کی کامیابی اور حصولِ قوّت و اقتدار کے لئے ہر قسم کی جد و جہد میں مشغول رہتے ہیں۔ اور اس کام کے لئے ہر قسم کے اسباب و وسائل بروئے کار لاتے ہیں ——— غرض اس تماشہ گاہِ عالم میں سیاست کی رنگا رنگی ہر روز ایک نیا منظر پیش کرتی ہے۔ اور زمانہ کے ہر موڑ کے ساتھ سیاست بھی اپنا رُخ بدلتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دین جو حق مطلق اور صداقتِ دائمی ہے۔ وہ ناقابلِ تغیّر ہے ——

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیّری ۔۔۔ بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

اس لئے اہل دین کے لئے ہر تغیر پذیر سیاسی نظریہ کی پرکھ کا معیار دین کے غیر متغیر حقائق ہیں۔ اور سیاسی فکر و نظریہ اور اس کے طریق کار کے حسن و قبح کی کسوٹی دین کی غیر متبدل حقیقت ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ ہر نظریہ فکر دین کے معیار پر کامل اُتر سکتا ہے۔ اور نہ ہر سیاسی نظام دین کہلایا جاسکتا ہے۔ نہ ہر غلبہ و تفوق کی کوشش کو "اسلامی ریاست" کہا جاسکتا ہے۔ اس بنا پر اہل دین و سالکین کے لئے ہر قسم کی سیاسی تگ و دو، کوشش و جستجو میں شرکت و اشتغال بغیر اسکی حقیقت و مآل کو جاننے کے ممکن نہیں۔ گو اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری نے سیاست کو "شجرہ ممنوعہ" قرار نہیں دیا۔ اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح "قیصر و خدا" کی دو علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور نہ ہی "سیاست" اسلامی ضبط عمل اور دائرۂ سلوک سے خارج ہے، تاہم خالص "اسلامی سیاست" کا "شجرۂ طیبہ" اپنی ہی زمین میں برگ و بار لاتا ہے۔ اور اسلامی دعوت کی ہمہ گیری اسے پروان چڑھاتی ہے۔ حضرت سید الملت قدس سرہٗ کا ارشاد ہے:

"اسلامی سیاست دعوت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ دعوت میں سیاست خود بخود آجاتی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فائنیس کے وزیر اور سیاسی قوتیں جمع نہیں کیں۔ نہ یہ کہا کہ آؤ مل کر حکومت کریں۔ صرف کلمہ کی طرف لوگوں کو بلایا۔ دین کی دعوت دی، سیاست ذیل میں خود بخود آگئی، گو اسلام میں سیاست اور دعوت علیحدہ نہیں ہیں۔ لیکن سیاست کے منافع اور ضرر سے دعوت پر بھی اثر پڑتا ہے ——"

ایک دوسری جگہ ارقام فرماتے ہیں:

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ مگر حقیقت ہے۔ کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی۔ وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد اور چند عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی بنی اُمیہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا۔ اور عباسیہ تہذیب و تمدن و آداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا۔ اس کے بعد ایرانی و ترکی و تاتاری سلاطین نے قرآن کے ساتھ آئین نوشیروانی اور تورۂ چنگیزی کا اضافہ کیا۔ وہ دین تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھتے تھے۔ مگر اُن کی سیاست اور خراج و باج کے آئین قیصر و کسریٰ اور چنگیز و ہلاکو کے دستور و قواعد پر مبنی تھے۔ اس لئے ہماری یہ پچھلی سلطنتیں مسلمانوں کی تو ضرور تھیں۔ مگر اسلام کی نہ تھیں۔ یعنی اُن کے فرمانروا مسلمان تھے۔ مگر ان کی حکومت کا قانون اسلامی نہ تھا۔ جس طرح آج انگریزی عہد میں "محمڈن لا" جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی تھی۔ تو کل صرف

نکاح و طلاق و وقف وغیرہ کے اجراء سے سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ الّا یہ کہ اس کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز و تساہل برتتے ہیں۔

یہ کہنا صحیح نہیں۔ کہ مسلمانوں نے اس اسلامی حقیقت کی تبدیلی کو آسانی سے مان لیا۔ جنگ جمل، جنگ صفین، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حجاج کی لڑائی، معرکہ کربلا، واقعہ حرّہ، جس میں اہل مدینہ نے بنو اُمیہ کے خلاف لڑائی لڑی، واقعۂ قراء جس میں علمائے عراق نے بنو اُمیہ کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ واقعہ نفس زکیہ جس میں سادات و علمائے حجاز نے مل کر عباسیہ کے خلاف پر زور بغاوت کی۔ یہ اور اس کے سوا دوسرے واقعات نے جن میں اصلاح و انقلاب کے علمبرداروں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ خونریزی اور فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔ اس لئے پچھلے متکلمین اور فقہاء نے یہ اصول بنا لیا۔ کہ ہر اصلاح طلبی میں یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ فتنوں کے لئے نئے دروازے تو نہیں کھلتے۔ اور حالات بد سے بدتر تو نہیں ہو جائیں گے ــــــ

ان اصلاح طلبوں اور انقلابیوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ انقلاب سے پہلے انہوں نے انقلاب کی دعوت کا دَور اپنے اُوپر نہیں گزارا۔ اور زمین میں ہل چلانے سے پہلے زمین میں تخم ریزی شروع کی۔ آخر اسی زمانہ میں ابومسلم خراسانی کی تحریک جس سے عباسیہ حکومت کا آغاز ہوا۔ اور اسماعیلیوں کی تحریک جس سے دولت فاطمیہ پیدا ہوئی۔ اور محمد بن تومرت کی تحریک جس سے موحدین مراکش کی سلطنت قائم ہوئی۔ کس طرح دعوت کی راہ سے بڑھی اور پھلی اور پھولی اور مدتوں قائم رہی ــــــ

زمانہ کے انقلابات نے آج بہت سے امکانات پیدا کر دئے ہیں۔ ہر جگہ شخصی سلطنتوں کے تحت خالی ہو گئے۔ دستوری اور جمہوری اور عوامی سلطنتوں کے آئین پر حکومتیں قائم ہو رہی ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں۔ کہ اسلامی اصول سلطنت پر کوئی سلطنت قائم کیوں نہیں ہو سکتی۔"

(معارف اعظم گڈھ ص ۲۵۱ ج ۶۰ نمبر ۴)

اس طویل اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ اسلام میں سیاست دین سے علیحدہ نہیں۔ لیکن اس کے وجود میں آنے اور اسے بروئے کار لانے کے لئے دعوت اور صحیح ذہنی و فکری تربیت کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینا پوری طرح خوش آئند نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ ہر سیاسی انقلاب سے پہلے مسلمانوں کی صحیح دینی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے ــــــ چنانچہ

ارقام فرماتے ہیں :

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے پیشِ نظر سیاسی انقلاب خواہ کتنا ہی خوش آئند ہو۔ اُن کے اعلیٰ مطمحِ نظر نہیں بن سکتا۔ ان کا اصلی مقصدِ حیات تو اشخاص کا عروج و زوال، پارٹیوں کی شکست و ریخت، وزارتوں کا عزل و نصب اور زمینوں کا ردّ و بدل نہیں۔ بلکہ عقائد و اصول کی تصحیح، مقصدِ حیات کی تعیین اور مسائل زندگی میں اسلامی نظام کی سچی تقلید اور پیروی ہے۔ اور اسکی برقراری کے لئے دلوں سچی تڑپ اور ناقابلِ سکون اضطراب، غرض ہم کو نئے سرے سے ایک نئی عمارت کا کام کرنا ہے۔

بحمد اللہ کہ مسلمان نوجوانوں میں اس حقیقت کا ادراک ہو رہا ہے۔ اور یہ آواز پہلے کی طرح اب نامانوس نہیں رہی ہے ـــــ کہ رجوع الی الاسلام، یعنی زندگی کے ہر اصول میں اسلام کی طرف بازگشت ہی ہر بیماری کا علاج ہے۔

اس لئے حکومت کا خواب دیکھنے والوں کو پہلے اسلام کا خواب دیکھنا چاہیئے۔ کہ اسلام کیا ہے۔ اس کا نظام کیا ہے۔ اس کے احکام کیا ہیں۔ اور اس کے مطابق ہمارے افراد کی زندگی ہے، یا نہیں۔ اگر نہیں ہے۔ تو ہمارے اندر وہ انقلاب کیسے پیدا ہو جو ہم کو ترکستان کی راہ سے ہٹا کر حجاز کی طرف لے جائے۔ جو ہم کو یورپ کی نقالی کی بجائے خود اپنی اصلیتِ مفقودہ کی تصویر ہم کو دکھا دے۔ تاکہ ہم خلافتِ موعودہ کے مستحق ٹھہریں۔

جب تک ہمارا مقصود صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین نہ ہوگا۔ اور اسی کے لئے روٹھنا اور منانا اور مرنا اور جینا نہ ہوگا۔ ہم اسی طرح ممبریوں اور وزارتوں اور لیڈریوں کے لئے آپس میں لڑتے، مرتے اور کٹتے رہیں گے۔ کیونکہ ہم نے اپنا مقصود انہیں شخصی اعزازات اور اسی جاہ و منصب کے حصول کو بنا رکھا ہے۔ اور اسی کا نام ہم نے اسلامی ترقی رکھ چھوڑا ہے۔

ضرورت ہے۔ کہ عقائد و عبادات کے ساتھ اسلامی سیاسیات، اسلامی اقتصادیات، اسلامی طریقِ تجارت، اسلامی اصول مضاربت یعنی (سرمایہ اور مزدوری کے طریقِ تعاون) اسلامی طریقِ کاشتکاری، اسلامی طریقِ کارخانہ داری، کسانوں اور مزدوروں کے اسلامی حقوق، اسلامی لین دین اور معاملات کے مسائل اور دیگر تمام ضروری امور زندگی کے متعلق خالص اسلامی حل لوگوں کے سامنے رکھا جائے۔ اور اس کے قبول و عمل کی دعوت دی جائے۔

جس سے اسلام کا نشاۃ ثانیہ ہو اور مسلمان مسلمان بن کر دنیا میں ظاہر ہوں ـــــــــ"

(معارف صہ ۲۴۳، ۲۴۴ نمبر ۴ جلد ۵۷)

سیاسی سطحی و وقتی ہنگامہ آرائیوں سے بچا کر ملت کی صحیح تعمیر کی دعوت دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"جماعت کی تعمیر صرف جذبات، جوش و خروش اور ہنگاموں سے نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی مقصد کے ساتھ عشق کی سی وابستگی اور اس کے حصول کی راہ میں جان و مال و عزت ہر چیز کی قربانی کا حوصلہ ہونا چاہیئے۔ اور اس راہ میں موانع کی جو شکلیں پیش آئیں۔ ان کے ازالہ اور برداشت میں صبر و ضبط اور عزیمت و استقلال اور حصولِ مقصد کے بعد اس حاصل شدہ مقصد کی بقاء کے لئے اخلاق کی بلندی، عیش و آرام کی زندگی سے پرہیز، مال و دولت اور جاہ و عزت کی حرص و محبت سے آزادی، مختلف عناصر کے مختلف افراد کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور مقصد کی بقاء کو ہر ذاتی منفعت اور ہر شخصی فائدہ مندی سے برتر جاننا اور رکھنا اور اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا، جب تک کسی جماعت کے افراد میں اکثریت اور اغلبیت کے ساتھ یہ اوصاف پیدا نہ ہوں گے۔ اوّل تو کوئی جماعتی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور ہو بھی جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔

اب ہم کو دیکھنا ہے۔ کہ آیا ہماری اس وقت کی جماعتوں میں یہ اوصاف پیدا ہیں۔ یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں۔ تو پیدا کرنے چاہئیں۔ اگر ہیں تو ان میں مزید ترقی اور پختگی کی فکر کرنی چاہیئے۔ اور ہمارے رہنماؤں کو چاہیئے۔ کہ وہ اپنی مختلف تحریکوں اور تعلیموں میں ان اصولوں کی تعلیم کے سبق دیا کریں۔ جماعتیں بھی بچوں ہی کی خاصیتیں رکھتی ہیں۔ اور اُن کی تعلیم و تربیت کے اصول بھی انہی جیسے ہیں۔

اسلام میں بدر کا معرکہ جو ۳۱۳ مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ ہر وقت پیدا کیا جا سکتا تھا، مگر بدر کے وقوع کے لئے تیرہ برس کے انتظار کی ضرورت پیش آئی۔ اور جب تک ٹھوک بجا کر اور آزمائشوں کی آگ میں تپا کر ان کو دیکھ نہیں لیا گیا۔ ان کو معرکوں میں نہیں لایا گیا۔ اس سے اندازہ ہوگا۔ کہ جماعتوں کی تعمیر صرف ضد اور ہٹ اور سب و شتم اور طعن و طنز اور شور و غل اور مختلف نعروں کے شعر پڑھنے اور چیخنے سے نہیں ہوتی۔ بلکہ مقصد کی بلندی، مقصد سے عشق نما وابستگی، اس کے حصول و بقاء کے لئے اعلیٰ اخلاق، پختہ سیرت اور مضبوط کریکٹر

پیدا کرنا ضروری ہے۔ تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں ہیں۔ کہ جماعت نے اپنے وحشیانہ جوش اور شجاعت سے کسی مقصد کو حاصل کر لیا، لیکن چونکہ اس کی بقاء کے لئے جو اخلاق اور کریکٹر چاہئے۔ اُن کے نہ ہونے سے وہ مقصد اُن کے ہاتھوں سے بہت جلد کھو گیا، ابھی ہندوستان کی تاریخ میں اودھ کی سلطنت، روہیلوں کی ریاست، سکھوں کی شاہی اور مرہٹوں کی پیشوائی میں عبرت کی داستانیں چھپی ہیں ــــــ" (معارف صہ ۱۶۲، ۱۶۳ / جلد ۵۷ نمبر ۳)

۱۹۴۵ء کے تاریخی الیکشن کے موقع پر مسلمانانِ ہند کو تلقین فرماتے ہیں :

"آج کل مسلمانوں میں الیکشن کا بحران ہے۔ اس بحران میں جس طرح نامعقول طریقوں سے لوگ اپنی قوت کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ حد درجہ نامناسب ہے۔ انتہا یہ ہے۔ کہ اس سلسلہ میں سب وشتم، لعن وطعن اور زد وکوب سے بھی پرہیز نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ طریق عمل استدلال کی قوت ظاہر کرنے کی بجائے اس کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ مذہب اور دین کی حمایت کا نام لیکر عوام کو جوش دلانا اور اس سے اپنا کام نکالنا غلط رہنمائی ہے جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ ضرورت اسکی ہے۔ کہ مسلمانوں کو ضبط، صبر، ڈسپلن، تنظیم، استقامت، تحمل، برداشت، ایثار، باہمی ہمدردی، عملی وحدت اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی جائے۔ جو سیاست کی جنگ کے سب سے کارگر ہتھیار ہیں۔ صرف زبانی جوش وخروش، گرماگرم محفلی اور اخباری بحث اور براہ راست دست وگریباں ہونا قوم کی طاقت نہیں۔ ہماری بحثوں کا موضوع مسائل کا صواب وخطا ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اشخاص کے محاسن ومصائب کا اظہار"

(معارف صہ ۲۶۶ / ج ۵۶ نمبر ۵)

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

"قومیں کاغذوں اور مسوّدوں سے نہیں بنتیں، وہ دلوں کے بدلنے اور ذہنیتوں کی اصلاح اور تعلیم وتربیت سے بن سکتی ہیں"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں :

"ضرورت دل ودماغ کے انقلاب کی ہے۔ جو صحیح دعوت فکر ہی سے ہو سکتی ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے ظاہر ہے۔ اس کے لئے شور وغل اور دعوت جنگ وبزد کی راہ غلط ہے۔ ہمارے علماء جدید ذرائع ووسائل کار سے ناواقف ہیں۔ جوش سے کام لیتے ہیں۔ ہوش سے نہیں۔ جہاد بالسیف سے زیادہ ضروری کام (ان حالات میں) جہاد بالقلم ہے۔ ان حضرات میں سراسر جوش ہی جوش ہے۔ جو اس زمانے میں چنداں

مفید نہیں۔ دلوں کا انقلاب غیظ و غضب جوش و خروش اور جذبہ انتقام اور استعجال سے نہیں پیدا ہوتا ــــــ"

ملت کی تعمیر میں تعلیم کی جو اہمیت ہے۔ اس کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں :

"ہم نے پہلے بھی کہا ہے۔ اور اب پھر کہتے ہیں۔ کہ مسلمان وقت سے پہلے طوفان کا اندازہ کرلیں۔ اور یہ سمجھ لیں۔ کہ ان کو ایسی تعلیم درکار ہے۔ جس سے مسلمان مسلمان بھی باقی رہیں۔ اور اس راہ میں جو غفلت سرکاری مدارس کے پہلے دور میں اُن سے ہو چکی ہے، وہ اس آنے والے دور میں نہ ہو ــــــ تعلیم کی اہمیت بہت بڑی ہے۔ یہی وہ سانچہ ہے۔ جس میں ملت کے نوجوان افراد ڈھل کر نکلتے ہیں۔ ان کی ذہنی تربیت، اخلاقی نشو و نما، دماغی استعداد اور قلبی قوت یقین، یعنی ساری ذہنیت اسی کے ذریعہ بنائی اور بگاڑی جاسکتی ہے۔ اُمت کو جیسے افراد کی ضرورت ہے۔ وہ اُسی کے ذریعے تیار ہوتے ہیں۔ اور ہو سکتے ہیں۔ خوب سمجھئے کہ ہندویت کی طرح اسلامیت کوئی قومیت یا وطنیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذہنی یقین اور اعمال و اخلاق کے ایک خاص طریق کا نام ہے۔ جس کی بقاء تعلیم و تربیت کے سوا اور کسی ذریعہ سے ممکن ہی نہیں۔ اس کی بقاء کے لئے تعلیم و تربیت کے ایک خاص نظام کی ضرورت ہے۔ جو مسلمانوں کے مسلمان رہنے اور بننے میں مدد دے۔"

قیام پاکستان کے بعد علامہ محمد یوسف صاحب البنوری کو بھوپال سے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"معلوم نہیں جہاں آپ ہیں۔ (یعنی پاکستان میں) کیا صورت حال ہے۔ کیا معنوی صورتیں مسلمانوں میں اُبھر رہی ہیں۔ یا صرف شور و غل اور ریا و نمائش ہے۔ یہ وقت جوش و خروش کا نہیں ہوش کا ہے ــــــ مسلمانوں کو ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔ کے مطابق صالح بننا چاہئے۔ اور وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کے مطابق ایمان و عمل صالح میں ترقی کرنی چاہئے۔ اس وقت مسلمانوں میں نظم، ضبط، ثبات قدمی، اطاعت امر اور جد و جہد و سعی و محنت، ایثار و اخلاق پیدا کرنے اور حب مال، حب جاہ اور حب نفس کے خبائث کو اندر اندر سے نکالنے کی ضرورت ہے ــــــ کاش میری یہ آواز مسلمانوں تک پہنچ سکتی۔"

اسی خط میں ۱۹۴۷ء کے خونچکاں ہنگاموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

"از ماست کہ بر ماست" مسلمانوں پر جو کچھ وبال ہے۔ وہ اُن کے اعمال کی سزا ہے۔ کاش

اب بھی قلوب میں انابت ہو۔ اور مسلمان سمجھیں کہ اُن کا مقصد اوّل اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ خواہ وہ تختِ سلطنت پر ہو۔ یا بوریائے فقیر پر، ان کو شیطان سے اس لئے مخاصمت نہیں۔ کہ یہ شیطان کا تخت زمین پر کیوں بچھا ہے۔ بلکہ اس لئے یہ مخاصمت ہے۔ کہ اس تختِ شیطنت پر شیطان کیوں بیٹھا ہے، وہ کیوں نہیں بیٹھے ہیں"

مندرجہ بالا مباحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی۔ کہ حضرت والا قدس سرہٗ سیاست کی خالص دینوی عصری ہنگامہ آرائیوں، سطحی شور وغل، اقتدار کی تگ و دو کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل کام مسلمان بننا اور بنانا تھا۔ جس کے لئے مسلمانوں کی صحیح اخلاقی ومعنوی، مذہبی و دینی تعلیم وتربیت کی اہمیّت و اہتمام کو ملّت کی تعمیر و بقار کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اسی اعلیٰ مقصد کی طرف وہ مسلمانوں کی سیاست کے رُخ کو بھی پھیرنا چاہتے تھے۔ اور ہر اس سیاست کو غلط سمجھتے تھے۔ جو مسلمانوں کے بنیادی مقاصد وعقائد کو زک پہنچائے۔ مسلمانوں کو وہ ایک بامقصد اور خاص طرزِ حیات وپیام کی حامل اُمت سمجھتے تھے۔ اور اسکی توانائیوں، قوتوں اور استعدادوں کو صرف اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے خاص کر دینا چاہتے تھے۔ اسی بناء پر علماء اور اہل فکر طبقہ کا موجودہ عملی دنیاوی سیاست میں کُلیتاً الجھ جانا پسند نہیں فرماتے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ کے نزدیک اس طبقہ کو محض قوم کی فکری و ذہنی رہنمائی اور صحیح اسلامی، اخلاقی و روحانی تربیت کرنا چاہیئے۔ اور "عملی سیاست" کے خار زار میں الجھے بغیر ملّت کو اسلامی سیاست، شرعی مقاصد، دینی اعمال وکردار کی تلقین وتبلیغ کرتے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک خط میں اپنے متعلق فرماتے ہیں:

"سیاست کے باب میں ابھی تک عزلت گزینی پر قائم ہوں۔ اور اسی میں اپنی فلاح سمجھتا ہوں اُمت کی خدمت صرف سیاست ہی پر منحصر نہیں"

(باقی آئندہ)

دُعائے مغفرت

ریاست سوات کے محکمہ قضا کی وساطت سے جناب معین دار صاحب سکنہ منگورہ کی وفات کی اطلاع موصول ہوئی۔ مرحوم الحق کے معاون اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ خداوند قدوس مرحوم کو درجاتِ عالیہ اور مغفرتِ تامہ اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ادارہ مرحوم کے لواحقین ومتعلقین کے اس غم میں شریک ہے۔ (ادارہ)